غلام عباس کے افسانوں میں تصورِ انسان

ڈاکٹر شائستہ حمید خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

CONCEPT OF HUMAN IN SHORT STORIES OF GHULAM ABBAS

Shaista Hameed Khan, PhD
Assistant Professor of Urdu
GC University, Lahore

Abstract

Ghulam Abbas enjoys a prominent place in Urdu fiction. His short stories give the reflection of the problems of those who are close to reality. He has also written on issues of the middle class. He describes the different aspects of human psychology concluding that human is under the control of his fate. The concept of human in the short stories of Ghulam Abbas is unlike that of Iqbal's which is ideal and complete in all respects. The man in writing of Ghulam Abbas acquire different shapes and shades of life. To protest or desire to bring revolution and change in the society or not to accept the situation, are not the roles of his short stories. He presents a different type of human being in his short stories which has been highlighted in this article.

Keywords:

افسانہ، سایہ، کتبہ، بردہ فروش، غلام عباس، سید معراج نیر، سنگ مرمر

غلام عباس یا کسی بھی افسانہ نگار کے ہاں ہم اقبال کی طرح مردِ مومن یا مردِ کامل کی صورت میں انسان کا تصور نہیں کر سکتے۔ افسانہ پروٹوٹائپ (Prototype) ہے اور یہاں ہم مختلف کرداروں میں انسان کی مختلف صورتیں، اشکال اور Shades دیکھتے ہیں۔ افسانہ نگار کے ہاں کردار بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن میں انسان کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں۔ غلام عباس کے افسانوں میں انسان کا ملا جلا تصور ملتا ہے۔ یہاں زیادہ تر انسان مجبور، بے بس اور لاچار ہے۔ ان افسانوں میں انسان کہیں اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اور کہیں معاشی اور کہیں طبقاتی محرومیوں میں مبتلا کسی طور پر زندگی گزار رہا ہے۔ انسان مجبور محض ہے اور زندگی اسے جس بھی مقام پر لے جائے وہاں جا کر وہ اپنے آپ کو مجبور ہی پاتا ہے۔ کہیں وہ مفاہمت، مصالحت یا سمجھوتا کرتا ہے اور اگر ایسا نہ بھی کرے تو اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ دراصل یہی انسان کی اصل ہے جو غلام عباس کے افسانوں میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں ہمیشہ جیتے جاگتے، گوشت پوست کے بنے انسان نظر آتے ہیں جن کی اُلجھنیں اور مسائل حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہاں ہمیں خیالی یا مافوق الفطرت انسان یا واقعات نظر نہیں آتے۔ گو ہر افسانہ انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو سامنے لاتا ہے تاہم معاشرت، ماحول اور حالت کا فرق ہے جس سے انسان، اُس کے رویے، عادات و اطوار، نفسیات منفرد طور پر سامنے آتی ہے۔ یہاں مختلف قماش اور پیشوں سے تعلق رکھنے والا انسان منسلکہ مسائل اور پوری زندگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مختلف النوع انسان، ان کے افسانوں میں تنوع کا باعث بنتا ہے۔ ن۔ م۔ راشد ''جاڑے کی چاندنی'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''غلام عباس محض چھوٹے آدمی کا داستان گو ہے، اسے کبھی وہ شہر کے کسی دُور افتادہ محلے میں جا ڈھونڈتا ہے اور کبھی گاؤں میں جا نکلتا ہے۔ سب سے پہلے اس کے گرد و پیش کی تصویر کھینچتا ہے کیونکہ اس کے لیے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں کہ کوئی انسان ماحول سے الگ تھلگ اپنے اندر ہی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اس کا کوئی کردار اپنے آپ میں سرمست نہیں بلکہ اپنے ماحول کا لازمی جزو ہے۔'' (۱)

غلام عباس نے معاشرے میں متوسط طبقے کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانے زندگی کے حقائق اور مشاہدے پر مبنی ہیں جس کا مرکز انسان اور فقط انسان ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''غلام عباس کے مرد وزن کی دنیا'' میں لکھتے ہیں:

''اگر غلام عباس کے فن کی اساس دریافت کرنے کے لیے کسی لفظ کی تلاش ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ اسے لفظ 'انسان' (مزید صراحت کے لیے اسے مطالعۂ انسان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے) سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ غلام عباس نے اپنے معاصر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی مانند انسان کا 'کلٹ' نہیں بنایا۔''(۲)

غلام عباس نے انسان کو اپنے افسانوں میں تقدیر کا تابع دکھایا ہے۔ حالات کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا، انقلاب برپا کرنا یا معاشرے میں تغیر لانا یا حالات کو تسلیم نہ کرنا اور بغاوت کر دینا اُن کے کرداروں کا خاصہ نہیں ہے۔ غلام عباس مثالی کردار یا ایسا ہیرو اپنے افسانوں میں نہیں دکھاتے جو مسائل پر آسانی سے قابو پالے۔ اُن کے افسانوں میں انسان، روح اور جسم کا تعلق کسی نہ کسی طرح قائم کیے ہوئے ہے۔ وہ تقدیر کے لکھے سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ یہاں انسان خود سے بھاگ کر جائے بھی تو کہاں جائے۔ اس لیے انسان کو اپنے حالات یا مسائل کے مطابق آپشنز منتخب کرنے میں زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا کیوں کہ وہ بغاوت کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ اسی لیے اس کے پاس انتخاب کی گنجائش نہیں۔

''بردہ فروش'' میں ریشماں کا کردار اس بات کا عکاس ہے کہ بچپن میں کوئی شخص اسے شہر کے ایک محلے سے اٹھالے بھاگا تھا۔ اس نے مختلف دیہات میں پرورش پائی تھی۔ اسے بردہ فروشوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا۔ سب سے پہلے ایک سودائی اس کے پلے پڑا۔ مائی جمی سے اس دوران میں اس کی ملاقات ہوئی تو وہ ریشماں کو وہاں سے بھگالے گئی اور مائی جمی نے اسے اپنے پیشے کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ پہلے اسے کرم دین کے ہاں رکھا وہ ایک ظالم شخص تھا۔ مائی جمی کا بردہ فروشی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ریشماں کو فروخت کر دیتی پھر ریشماں وہاں سے زیور، پیسہ لے کر فرار ہو جاتی۔ کرم دین کے بعد ریشماں کو چودھری گلاب کے ہاں بھیجا گیا۔ چودھری گلاب ایک سیدھا سادا، بے آزار انسان تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہونے کی وجہ سے ریشماں کو عزت، پیار اور آرام ملا جو اسے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ اس لیے وہ چودھری گلاب کا گھر چھونے کے لیے تیار نہ تھی لیکن مائی جمی اسے اس پیشے سے ہٹنے نہ دینا چاہتی تھی۔

ریشماں کے کردار میں یہ اچانک سے بغاوت اسے اپنے آپ کو بچانے کا پہلا اور آخری راستہ ہی تھا۔ یہاں کم از کم اس نے سر تو اٹھایا لیکن آخر کار وہ بے بس ہی نظر آتی ہے۔ جب مائی جمی کی وجہ سے چودھری گلاب پر ریشماں کی اصلیت کرم دین آکر کھول دیتا ہے، اس وقت ان دونوں مردوں کی فطرت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے جو پہلے تو ریشماں کے لیے لڑنے کو تیار ہوتے ہیں پھر مائی جمی کے روپے واپس کرنے پر ریشماں کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ چاہے وہ کرم دین جیسا ظالم شخص ہو یا چودھری گلاب جیسا صوم و صلوٰۃ کا پابند شخص، یہ دونوں انسان ترازو کے دونوں پلڑوں پر برابر اُترتے ہیں۔

غلام عباس نے یہاں مرد کی فطرت بڑے مؤثر انداز میں عیاں کی ہے اور ریشماں کی قسمت میں پھر سے بکنا لکھا ہے۔ ریشماں نے مقید پنچھی کی طرح پر مارے لیکن اب وہ جان گئی تھی کہ اسے اپنے انھی حالات سے سمجھوتا کرنا ہے۔

''سمجھوتا'' میں بھی انسان مجبور اور بے بس ہے۔ بیوی کا بے وفا ہونا اور گھر سے بھاگ جانے کے بعد شوہر کا بازارِ حسن کا رخ کرنا، یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ اس لیے غلام عباس اس کی نفسیاتی کیفیت بیان کرتے ہیں نیز اسے خیر و شر میں امتیاز بھی یاد ہے پھر بھی حالات اسے چند لمحات میں ہی تبدیل کر دیتے ہیں۔ اچانک اس کی بیوی واپس آجاتی ہے۔ وہ اسے گھر میں پناہ تو دے دیتا ہے مگر اس سے بات تک نہیں کرتا۔ جب طوائفیں اس کی چیک بک چاٹ جاتی ہیں تو وہ اپنی ہی بیوی سے رجوع کر لیتا ہے۔ یہاں معاشی طور پر مجبوری اسے سمجھوتے کی راہ خود ہی نکالنے پر آمادہ کرتی ہے۔

''چکر'' میں چیلا رام کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے جو سیٹھ چھنامل کے ہاں ملازم ہے اور دن بھر گرمی میں کام کرتا ہے۔ مال گودام میں لے جانا، بینک میں روپیہ جمع کرانا، رجسٹریاں ڈاک میں بھیجنا، سیٹھانی کے لیے نسخہ بنوانا اور سیٹھ کے منجھلے لڑکے کے لیے کتابیں خریدنا، دن بھر شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا۔ جب تمام کام کر کے سیٹھ کو حساب دے کر وہ گھر لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا ہمسایہ تانگے والا رولو گھوڑے کو تانگے سے الگ کر کے اور زین اور گھنگرو اُتار کر ایک ماشیے سے گھوڑے کی مالش کروا رہا ہے۔ اس کی بیوی اسے آواز دیتی ہے کہ بھوجن کبھی کا تیار ہو چکا ہے، اب اندر آجاؤ۔ چیلا رام اب بھی خاموش رہا۔ افسانہ نگار نے آخر میں سوال کیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا وہ

آواگون کے مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ اب کے جب وہ مرے تو اس کا جنم گھوڑے کی جون میں ہو۔اسے اپنی زندگی سے بہتر گھوڑے کی زندگی محسوس ہوئی جس کا مالک اس کا خیال رکھتا ہے،اس کی مالش کرواتا ہے۔ غلام عباس نے معاشرے پر طنز کی ہے۔وہ جانوروں کو انسان پر فوقیت دیتے ہیں۔ایک طرف تو جانور کا خیال رکھا جا رہا ہے اور دوسری طرف انسان کی حالت زار ہے۔یہاں غلام عباس نے انسان اور گھوڑے کا موازنہ کر کے انسان کی اوقات بیان کی ہے۔

''اوورکوٹ'' میں انسان زندگی میں ملنے والی محرومیوں کا کچھ دیر کے لیے ہی سہی مداوا کرنا چاہتا ہے۔یہ فرار وقتی ہے لیکن اونچے طبقے کی طرح وہ اوورکوٹ پہن کر اپنی مفلسی کا بھرم رکھتے ہوئے زندگی سے حظ اٹھانا چاہتا ہے۔وہ غربت یا مفلسی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتا بل کہ اپنی محرومیوں، بے بسی اور مجبوری پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔خواہ یہ کوشش بھیس بدل کر ہی کیوں نہ کی جائے۔

''کتبہ''میں شریف حسین جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے،بازار سے گزرتے ہوئے سنگِ مرمر کا ایک ٹکڑا خرید لیتا ہے جس کے خریدنے کے بعد اپنے گھر کی خواہش اس کے دل میں جنم لیتی ہے اور یہ خواہش آہستہ آہستہ پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔شریف حسین کی کہانی اس طبقے اور پیشے سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کی کہانی ہے جو عمر بھر ترقی،آسودگی اور خواہشات کی تکمیل کا سوچتے سوچتے مر جاتا ہے۔ حالات اسے محنت کی طرف اکساتے ہیں تو وہ محنت کرتا ہے لیکن اس کی محنت کے باوجود اس کی ناتمام خواہش، حسرت میں ہی تبدیل ہوئی۔زندگی کے مراحل، کلرکی، شادی، بچے، حج کی خواہش، بیٹی کی شادی، مکان بنانے کی خواہش، مکان کا کتبہ آخر قبر کا کتبہ بن جاتا ہے۔جب وہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھتا ہے تو اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔اس نے پہلی بار اپنا نام جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔شریف حسین کی نفسیاتی کیفیت بھی غلام عباس نے بیان کی ہے۔

''بہروپیا''میں انسان روپ بدل کر اپنی محرومیوں کو ختم کرنے کی کوشش میں ہے لیکن اس کے مسائل پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔دو بچے بہروپیے کا پیچھا اس کی اصلیت دیکھنے کی خواہش میں کرتے ہیں لیکن وہ کوشش کے باوجود اس میں ناکام ٹھہرتے ہیں۔شہزاد منظر ''غلام عباس ایک مطالعہ''میں لکھتے ہیں :

''غلام عباس کے افسانوں کے کردار عام لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری اور آپ کی زندگی کے جیتے جاگتے کردار جن کا تعلق متوسط طبقہ سے بھی ہے اور محنت کش طبقہ سے بھی۔ ان کے افسانوں میں ہر قسم کے کردار ملتے ہیں۔ کلرک (چکر اور کتبہ)، خوانچہ فروش (سایہ اور بامبے والا)، مہترانی (ذکر اس پری وش کا)، موسیقار (کن رس)، مولوی (بھنور) اور بے روزگار (اوور کوٹ) وغیرہ۔ غلام عباس نے اپنے افسانوں میں ان کے دکھ سکھ کی نہایت حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔'' (۳)

''بھنور'' میں شفاعت احمد خان طوائفوں کی اصلاح کے لیے نکلتا ہے لیکن وہ معاشرے میں ایک طوائف کو گناہ اور بدی کا راستہ چھوڑنے پر بھی کوئی مقام نہیں دلا پاتا کہ دوسری طوائف اس کے دروازے پر آن کھڑی ہوتی ہے۔ شفاعت احمد خان کوشش ضرور کرتا ہے لیکن معاشرہ جن انسانوں سے مل کر بنا ہے وہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف نہیں چل سکتے۔ حاجی شفاعت احمد خلوصِ دل سے بہار، جس کا نام انھوں نے بلقیس رکھا تھا، کی کفالت کرتے ہیں۔ اس کی شادی کرتے ہیں لیکن تین بار شادی کے باوجود اس کا گھر نہیں بستا اور کہانی کے آخر میں بہار کی بہن گل، حاجی صاحب کے دروازے پر آجاتی ہے۔

''اس کی بیوی'' میں نوجوان اپنی مرحومہ اور بے وفا بیوی کی تلافی ایک طوائف نسرین سے کرتا نظر آتا ہے۔ اس کہانی کا موضوع انسانی نفسیات ہے۔ نوجوان کی بیوی تین ماہ پہلے مر چکی تھی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ وہ نسرین میں اپنی مرحومہ بیوی کی جھلک دیکھتا ہے اور اس میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ نسرین اور اپنی بیوی نجمہ میں مماثلت تلاش کرتا ہے۔

''حمام میں'' میں فرخ بھابھی کا کردار بنیادی ہے۔ فرخندہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنے سسرال کے مظالم سے تنگ آکر انھیں چھوڑ کر آگئی تھی۔ وہ لاوارث تھی۔ اسٹیشن پر کسی بڑھیا کے ہاتھ لگنے سے عدیل نے اسے بچایا تھا۔ اس کے رہنے کا بندوبست کیا۔ اس کے لیے سلائی مشین کا انتظام کیا۔ ملازم رکھ کر دیا کہ وہ نکٹائیاں سیتی اور ملازم بیچ آتا۔ یوں زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے گھر مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا آنا جانا تھا۔ سب اسے فرخ بھابھی کہا کرتے تھے اور وہ بھی سب کے کام آیا کرتی تھی۔ سب کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے گھر آنے والوں میں عدیل، ڈاکٹر ہمدانی، بیمہ ایجنٹ، بھٹنا گر،

دیپ کمار، نوجوان شاعر شکیبی، باکمال مصور اور فوٹو گرافر مسٹر سنگھا بھی تھے۔ ان سب کے علاوہ مولانا صاحب جن کو فرخ بھابھی نے انسانیت کی وجہ سے اپنے گھر رکھ لیا تھا، موجود رہتے تھے۔ غلام عباس نے ان تمام کرداروں کا تعارف تفصیل سے کرایا ہے۔ یہ سب مل کر فرخندہ کے گھر بیٹھتے، مختلف موضوعات پر گفت گو کرتے، دستر خوان لگتا تو مل جل کر کھانا کھاتے۔ اس افسانے میں فرخندہ کی نئی سلائی مشین چوری ہو جانے کے بعد معاشی طور پر اس کا مجبور ہو جانا دکھایا گیا ہے۔ ان تمام حضرات میں سے سب اسے تسلیوں اور دلاسوں کے سوا کچھ نہیں دے پاتے۔ حتیٰ کہ وعدہ بھی کرتے ہیں لیکن بے سود۔ ایک شام مولانا، فرخ بھابھی کے گھر میر صاحب کے ساتھ داخل ہوئے اور ان کی آمد محسن عدیل اور دیپ کمار کو پسند نہیں آتی۔ مولانا، میر صاحب کا تعارف کرواتے ہیں۔ میر صاحب دو تین ملاقاتوں کے بعد اس کے گھر دوبارہ نہیں آتے اور پھر فرخندہ میں آنے والی تبدیلیاں بھی تمام حضرات محسوس کرتے ہیں۔

''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون'' میں سیلون کے مالکان اتنے کم زور ہیں کہ وہ عیار منشی کی چال سمجھ نہیں پاتے۔ چاروں حجام اپنے آپ کو منشی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس افسانے میں منشی اس معاشرے کے مکار اور عیار کرداروں کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ ایسی سفاکی سے وہ سیلون کا نہ صرف مالک بن جاتا ہے بل کہ چاروں حجام اس کے ملازم قرار پاتے ہیں۔

''بامبے والا'' میں ایک غریب بامبے والا کالونی کے بزرگوں کی وجہ سے بلاوجہ ظلم و ستم کا نشانہ بنتا ہے۔ دو لڑکیوں کو اس کالونی میں ان کا کاٹھیاواڑی کتھک بھگا لے جاتا ہے اور کالونی کے بوڑھے، بزرگ اس کا غصہ اس غریب اور معصوم بامبے والے پر نکالتے ہیں۔ اسے مارتے پیٹتے ہیں کہ اس دن کے بعد کالونی میں کبھی بامبے والے کی آواز نہیں آتی۔ یہاں بھی انسان مجبور اور بے بس ہے۔

''سایہ'' میں سبحان ٹھیلے والے کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ وہ وکیل صاحب کے مکان کے باہر ٹھیلا لگاتا ہے جس سے اس کی روزی روٹی چلتی۔ وہ وکیل صاحب کے گھر والوں نیز ان کے حالات سے بھی آگاہ ہے لیکن اس حوالے سے سبحان کا کسی کو علم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ریاض اور وکیل صاحب کی بڑی صاحب زادی کے درمیان محبت کا علم بھی سبحان کو ہی ہوتا ہے۔ ایسے انسان جنھیں زندگی میں اہمیت

نہیں دی جاتی نامعلوم طور پر وہ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ڈاکٹر انوار احمد ''اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ'' میں لکھتے ہیں:

''غلام عباس کی بصیرت جس طرح ایک فرد کے بطونِ ذات کا احاطہ کرتی ہے، اس طرح ان کی کہانیوں میں اجتماعی زندگی کے دکھ سکھ، محرومیاں، تلخیاں، خوشیاں، تتلیوں کی طرح رقصاں اور پروانوں کی طرح سلگتی دکھائی دیتی ہیں۔''(۴)

گو غلام عباس کے افسانوں میں فرد کی ذات کے ساتھ اجتماعی زندگی کے مسائل سب سامنے آتے ہیں اور یہ سب انسان اور اس کے معاشرے سے وابستہ ہیں۔ڈاکٹر علم دار حسین بخاری ''غلام عباس کی افسانہ نگاری''میں لکھتے ہیں:

''ان کے افسانوں کے کرداروں میں احتجاج یا جدل آزمائی کی بجائے سلامت روی، بل کہ سمجھوتا بازی کا رحجان غالب دکھائی دیتا ہے۔''(۵)

غلام عباس کے ہاں انسان میں اتنی قوت ہے کہ خواہ کتنی بھی مشکل اور پریشانی آئے وہ جینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ڈاکٹر سید معراج نیّر ''ترقی پسند افسانے'' میں غلام عباس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''غلام عباس اپنے افسانوں کا مواد اپنے ماحول اور اطراف سے حاصل کرتے ہیں۔ان کے کردار بھی ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔''(۶)

غلام عباس نے انسان کو ایسے ہی پیش کر دیا جیسا کہ وہ ہے۔وہ حقیقت نگاری تو کرتے ہیں لیکن اس میں بھی انسانی زندگی کو اہمیت حاصل ہے۔غلام عباس ایک انٹرویو میں افسانے کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''افسانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے کہ اس کو زندگی کا ایک ایسا پہلو نظر آجائے جو عام لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہو۔اس کے ساتھ ساتھ دماغی اختراع کو بھی دخل ہے یعنی وہی خیال آرائی۔''(۷)

غلام عباس نے اپنی زندگی میں بے شمار انٹرویو دیے اور افسانے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔وہ عام لوگوں کی نظروں سے چھپے ہوئے انسان دکھاتے ہیں۔ڈاکٹر رونق جہاں بیگم ''اردو افسانے میں حقیقت نگاری''میں لکھتی ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ غلام عباس غیر معمولی حد تک عقلیت پسند فن کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق کے اظہار میں انھوں نے کبھی سودے بازی نہیں کی ہے۔ ان کی تحریروں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ حالات کے دھارے کو موڑنے اور انجام کو جبراً خوشگوار بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔۔۔ان کے کردار پہلے سے طے شدہ یعنی ٹائپ نہیں ہوتے بلکہ ماحول اور معاشرے میں رہنے والے معمولی افراد ہی ہوتے ہیں لیکن غلام عباس انھیں زندگی کی پوری رعنائیوں اور حقیقتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں لہٰذا ان کے کردار جاندار، متحرک اور دلچسپ ہوتے ہیں۔''(۸)

غلام عباس نے انسانی نفسیات کے مختلف پہلو بھی دکھائے نیز انسانی فطرت بھی خوبی کے ساتھ پیش کی۔ انھوں نے زندگی کی حقیقت بیان کرنے کے لیے مثالیت پسندی نہیں کی۔ انھوں نے صداقت سے کام لیتے ہوئے انسان کو پیش کیا ہے۔ غلام عباس نے اپنے افسانوں میں فریب انسانی کو موضوع بنایا ہے۔ مثلاً جواری کا ہیرو نشے میں مست ہے چاہے وہ ذلیل بھی ہو گیا اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ کسی بھی قسم کی بناوٹ انسانی زندگی میں پیش نہیں کرتے کہ انسانی کردار مثالی بن جائیں یا انتہا پسندی کا شکار ہو جائیں۔

غلام عباس نے عام لوگوں کی نظروں سے چھپے ہوئے انسان دکھائے ہیں جو سماج میں ہمارے ارد گرد موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں نظر بھی آتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں یا ہم ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ معمولی انسان عموماً عام لوگوں کی نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے لیکن غلام عباس کی گہری نظر اور قوتِ مشاہدہ ان عام انسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو جانچ لیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) ن۔م۔راشد، دیباچہ: جاڑے کی چاندنی، غلام عباس،افسانے،لاہور: ابلاغ پبلشرز،۲۰۰۴ء، ص ۲

(۲) سلیم اختر، ڈاکٹر، غلام عباس کے مرد وزن کی دنیا، مشمولہ: افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۱۸۹

(۳) شہزاد منظر، غلام عباس ایک مطالعہ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص۳۶

(۴) انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۳۵۰

(۵) علمدار حسین بخاری، غلام عباس کی افسانہ نگاری، مشمولہ: غلام عباس، فکر و فن، مرتبہ: ایم خالد فیاض، راولپنڈی: نقش گر، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۱

(۶) سید معراج نیر، ترقی پسند افسانے، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۳۱

(۷) غلام عباس، انٹرویو، بعنوان: کہانی کار کی کہانی، مشمولہ: حرف من و تو، مرتبہ: ڈاکٹر آصف فرخی، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص۴۱

(۸) رونق جہاں بیگم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں حقیقت نگاری، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۴

❖❖❖